پاکستانی اُردو ناول پر عالم گیریت کے اثرات: اکیسویں صدی کے تناظر میں

The Effects of Globalization on Pakistani Urdu Novel in the Perspective of the 21th Century

غلام عباس [i] ڈاکٹر فرزانہ کوکب [ii]

Abstract:

In the contemporary era, globalization has influenced every sphere of human life, resulting in significant transformations in literature, culture, language, and concepts of human identity. The Urdu novel, being a representative genre reflecting social life, has also been deeply affected by these changes. In Pakistani Urdu novels, the representation of capitalism, consumerism, media culture, cultural conflict, identity crisis, migration, western influences, and emerging social values has become highly prominent. The Pakistani Urdu novel of the twenty-first century is no longer confined to local issues; rather, it incorporates global political, economic, and cultural changes into its thematic structure. Pakistani Urdu novelists have portrayed changing human attitudes, social disintegration, class differences, and cultural conflicts in a realistic and critical manner.

Keywords: *Globalization, Urdu Novel, Pakistani Literature, Capitalism, Consumerism, Media Culture, Cultural Conflict, Identity Crisis.*

عصرِ حاضر میں عالمگیریت نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے جس کے نتیجے میں ادب، ثقافت، زبان اور انسانی شناخت کے تصورات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اُردو ناول، جو معاشرتی زندگی کا آئینہ دار صنفِ ادب ہے، ان تبدیلیوں سے گہرے طور پر متاثر ہوا ہے۔ اس تحقیق میں پاکستانی اُردو ناولوں میں سرمایہ دارانہ نظام، صارفیت، میڈیا کلچر، تہذیبی تصادم، شناخت کے بحران، ہجرت، مغربی اثرات اور نئی سماجی اقدار کی عکاسی نمایاں ہے۔ اکیسویں صدی کا پاکستانی اُردو ناول محض مقامی مسائل تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے عالمی سیاسی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بنایا ہے۔ پاکستانی اُردو ناول نگاروں نے بدلتے ہوئے انسانی رویّوں، معاشرتی انتشار، طبقاتی تفاوت اور تہذیبی کشمکش کو حقیقت پسندانہ اور تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔

کلیدی الفاظ: عالمگیریت، اُردو ناول، پاکستانی ادب، سرمایہ دارانہ نظام، صارفیت، میڈیا کلچر، تہذیبی تصادم، شناخت کا بحران۔

اُردو ادب میں عالم گیریت (Globalization) ایک مقبول اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ یہ اپنی نوعیت میں ایک دلچسپ سرگرمی ہے۔ ایک طرف تو گلوبلائزیشن کی وجہ سے ساری دنیا ایک گاؤں کی مانند ظہور پذیر ہوئی ہے اور عالمی انسانی معاشرت کو فروغ دے چکی ہے۔ یہ عالمی انسانی معاشرت نے منظر نامے میں بہت پیچیدہ صورت حال اختیار کر چکی ہے۔ اس قربت نے جہاں انسانوں کو بہت سے فائدے دیے ہیں وہیں اس کے بے شمار مضر اثرات بھی عالمی سماج پر مرتب ہو رہے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اس عالم گیریت نے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایک طرف یہ ممالک اس تحریک کی وجہ سے عالمی معاشی

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاءُ الدین یونی ورسٹی ملتان۔
[ii] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءُ الدین یونی ورسٹی ملتان (Corresponding Author)

دھارے میں شامل ہو رہے ہیں، آئے دن نئی ایجادات پر تصرف حاصل کر رہے ہیں، ٹیکنالوجی سے واقف ہو رہے ہیں، جدید زرعی آلات کو استعمال کرنا سیکھ رہے ہیں، علوم کی نئی اقسام اور استعمال سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، وباؤں کی صورت میں دنیا بھر کے تعاون سے مستفید ہو رہے ہیں وہی عالمی طاقتوں میں طاقت کے حصول کی جنگ میں بری طرح پستے بھی جا رہے ہیں۔ ان ممالک کا انفراسٹرکچر چوں کہ بہت کم زور ہوتا ہے اس لیے یہ بڑی طاقتوں کے مفادات کے تحفظ میں چاہتے ہوئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو اس کے اسباب میں دو اہم محرکات نظر آتے ہیں:

۱۔ انسانی علوم و فنون میں ترقی اور جدید سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی میں بے حد اضافہ کائنات پر دسترس کی کوششیں اور عالمی میڈیا کی جدت ساری دنیا کو ایک پیج پر لا چکی ہیں۔ ساری دنیا کو یہ اکٹھ عالم گیریت کو فروغ دیتا رہا ہے۔

۲۔ بڑے ممالک کے درمیان طاقت کے حصول اور اپنے معاشی حالت کو مستحکم کرنے کی کوششوں نے بھی گلوبلائزیشن کو فروغ دیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو اپنی مصنوعات (ٹیکنالوجی، الیکٹرونکس، اسلحہ وغیرہ) کی فروخت کے منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سفارتی طریقے سے یا زبردستی دوسرے ممالک کو اپنے زیر اثر کر کے اپنی مصنوعات کو فروخت کرتے ہیں۔ دنیا کی صورتِ حال پر اگر نظر کی جائے تو یہ دوسری وجہ زیادہ مستعمل ہے۔ عالمی معاشی نظاموں کی چپقلش نے بھی عالم گیریت کو تیزی سے فروغ دیا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ عالم گیریت گذشتہ چار دہائیوں سے ایک مقبول تحریک کے طور پر بھی رائج ہے جس نے دنیا بھر میں سیاست، تہذیب، ثقافت، سماج اور معیشت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عالم گیریت کو ایک ایسا وسیع تصور کہا جا سکتا ہے جو جغرافیائی حد بندیاں ختم کر کے دنیا بھر کے لوگوں کو سماجی، ثقافتی اور سیاسی نظام کی بدولت ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ عالم گیریت کی ابتدا تو انسانی زندگی کے آغاز سے ہی ہوئی مگر عالم گیریت کے قدیم اور جدید تصورات میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ عالم گیریت کا قدیم تصور اقتدار اور دوسری قوموں پر تسلط کا تصور ہے جس میں سمیری تہذیب، سلطنتِ مقدونیہ، سلطنتِ روم اور عرب سلطنت شامل ہیں جنھوں نے دوسری قوموں پر جنگیں مسلط کر کے اقتدار کے حصول کو یقینی بنایا۔ جب کہ عالم گیریت کے جدید تصورات میں سرد جنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس تصور میں نئی ٹیکنالوجی، نئی ایجادات اور نئی معاشی پالیسیوں کے تحت کم زور ممالک کو معاشی لحاظ سے اپنے زیر اثر کیا جاتا ہے اور طاقت وَر ملک اس

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

نظام کے ذریعے اپنے آپ کو برتر محسوس کرواتے ہیں۔ عالم گیریت کا ہدف ایک ایسا سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنا بھی ہے جس میں مختلف اقسام کی اشیائے ضرورت بنا کر پوری دنیا میں اس کے صارفین پیدا کیے جا سکیں۔ سرمایہ کار اپنے اس مقصد کے لیے مختلف مصنوعات بنا کر میڈیا کے ذریعے ایک زبردست تشہیری مہم چلاتے ہیں جس سے دنیا کے ہر ملک کے لوگوں کا ذہن بنایا جاتا ہے کہ وہ ان اشیا کی خریداری کر سکیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کے حملے کے بعد عالم گیریت کے تصور میں ایک اور تبدیلی آئی جس میں پوری دنیا اور بالخصوص ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر ان سے جانب دارانہ سلوک کیا گیا اور طرح طرح کے عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔

اکیسویں صدی کے اُردو ناول میں عالم گیریت کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں محمد عاصم بٹ کا ناول دائرہ اہم ہے جس میں عالم گیر سطح پر انسان کی شناخت کے مسئلے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں انسان کی شناخت کے مسئلے کو عالم گیر ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں نئی صدی کی سائنسی ایجادات کے عام فرد کی زندگی پر اثرات کی نقش گری کی گئی ہے۔ اس صدی کا انسان طب، سائنس، ٹیکنالوجی غرض کسی بھی شعبہ ایجادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عالم گیریت کی نئی معاشی پالیسیوں سے استحصال شدہ کم زور اور متوسط طبقے کے حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے۔

بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ میں عالم گیریت کے تہذیبی پہلو کا اجاگر کیا گیا ہے۔ فلیش بیک تکنیک میں لکھے گئے اس ناول کا بنیادی موضوع دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ بہتر مستقبل اور بہتر طرزِ معاشرت کی تلاش میں پاکستان سے ہجرت کرنے والے خاندان خواہ امریکا میں بستے ہیں یا کسی اور یورپی ملک میں، دونوں تہذیبوں کو اپنی زندگی کا پوری طرح حصہ بنانے میں ناکام رہتے ہیں اور یوں انھیں ان کی زندگی میں داخلی سطح پر کرب اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا، جس میں عالم گیریت کے ایک اہم تصور غلبہ اور اقتدار کی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں ایک فرد دوسرے فرد پر اور ایک ملک دوسرے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان کو دہشت گرد اور شدت پسند سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان اکیسویں صدی میں ایک تحقیر آمیز حالت میں زندگی بسر کر رہے

ہیں۔ مختلف تکنیک میں لکھا گیا یہ ایک دل چسپ ناول ہے جس کے متعلق عبد اللہ حسین ناول کی طبع ثانی کا دیباچہ لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''غلام باغ'' اپنے مقام میں اُردو ناول کی روایت سے قطعی ہٹ کے واقع ہے، بلکہ انگریزی ناول میں بھی یہ تکنیک ناپید ہے۔ اس کے ڈانڈے یورپی ناول خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں۔[۱]

خس و خاشاک زمانے مستنصر حسین تارڑ کے قلم سے نکلا ایک شاہ کار ناول ہے۔ یہ ناول تقسیم سے قبل کے حالات، تقسیم کے وقت خون ریز فسادات، پاکستانی سیاست کا اتار چڑھاؤ اور سقوط ڈھاکا کی داستان ہے جو ۱۹۳۰ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک کے عرصے میں تین نسلوں کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک، مستنصر حسین تارڑ کی فنکارانہ بصیرت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> مستنصر حسین تارڑ کا نوعِ انسان کے ساتھ تعلق بہت گہرا اور عملی ہے۔ ان کی پیش بنی نہایت شفاف اور واضح ہے، جن کا بنیادی مرکز بر صغیر کے مسلمانوں کے حقوق ہے۔ دوسری طرف اس کے ہاں اس اشرافیہ کا بھی ذکر ہے جو مغربی نو آبادیاتی عناصر کے زیرِ اثر ہے اور سیاسی سماجی بحرانوں سے فراریت کی راہ تلاشتی رہتی ہے۔ فراریت کی اس فکر کے زیرِ اثر لوگ معروضی حقائق کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتے ہیں نہ ہی ان سے کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔[۲]

عالم گیریت کے زیرِ اثر یہ ناول ہندوستان میں بسنے والے سکھوں اور مسلمانوں کے ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جن میں انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی ذہن سے سوچیں اور اپنی روزمرہ زندگی میں انگریزی مصنوعات کا استعمال کریں۔ انگریز قوم کس طرح دوسری قوموں کو اپنا دستِ نگر رکھنا چاہتی ہے اور کس طرح اپنی ہوسِ اقتدار میں ان کا معاشی و سماجی استحصال کرتی ہے، یہ ناول اس صورتِ حال کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

ناول میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے حملے کے بعد اس کے مسلم اقوام پر اثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد عالمی طاقتوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے میڈیا کا غیر منصفانہ استعمال کر

کے اہلِ یورپ کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت کا بیج بو دیا اور یوں ان کے لیے اسلام اور دہشت گردی ایک ہی سکے کے دو رُخ نظر آنے لگے۔

عالم گیریت کے تناظر میں آمنہ مفتی کا ناول آخری زمانہ ایک اہم حوالہ ہے۔ آمنہ مفتی کا یہ ضخیم ناول اپنے اندر وسیع موضوعات رکھتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے یہ اپنے انداز کا واحد ناول ہے جس میں مذہب، سیاست، سماج، تہذیب، ثقافت، انسانی رویے، انسانی نفسیات، مذہبی شدت پسندی، اخلاقی بے راہ روی، عشق و محبت کی رومانوی کیفیات اور عالم گیر عصری منظر نامے کا خوب صورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں عالم گیر سطح کے سیاسی، سماجی اور مذہبی پہلوؤں کا کامیاب بیان ملتا ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول آخری زمانہ میں عالم گیری مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا ناول گویا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ہر صفحے پر پوری دنیا میں ہونے والے سیاسی، سماجی اور تاریخی حقائق بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے حال کو ماضی سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ جو کہ اکیسویں صدی کا زمانہ ہے اور اس میں پوری دنیا کے ممالک میں امریکا بہادر کے اثرات ہیں۔ امریکی اشرافیہ براہِ راست اور بالواسطہ طور پر ہر ملک کی سیاسی اور عسکری طاقتوں کو اپنے زیرِ اثر رکھتی ہے۔ اس ناول میں بھی نائن الیون کے بعد ہونے والے ان مسائل کا بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق عالم گیر مسائل سے ہے۔ ناول میں آمنہ مفتی نے خاص طور پر ریاستِ مدینہ کی عالم گیر توسیع کو بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ ریگستان سے ایک گروہ اٹھا اور اپنے ولولۂ ایمان اور ارادہ کی پختگی سے انھوں نے آہستہ آہستہ پوری دنیا کے اکثر ممالک کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔

> مسلمان کہاں سے اٹھے؟ سعودی عرب سے، پھر ان کی فتوحات رکی نہیں۔ کیوں کہ یہ سب بڑی سرحدیں تھیں۔ اور جہاں سمندر آئے، ان کو بھی پار کر لیا گیا۔ پاکستان بیرون عرب کی بندرگاہ اور شام کی میڈی ٹرینیں، درمیان میں افغانستان، ایران، عراق ادھر نیچے کویت اور پھر سعودی عرب، دنیا کا قلب، اگر امریکا یہاں پنجے گاڑھ لیتا ہے تو سارا یورپ، سارا افریقہ اور سارا ایشیا براہِ راست اس کی زد میں آ جائیں گے۔[۳]

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے ایک مثال کے ذریعے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کے

پاس ابتدا میں کوئی جنگی ٹیکنالوجی یا عسکری ساز و سامان نہیں تھا اور نہ ہی آج کے دور کی طرح بحری و بری راستے تھے مگر پھر بھی وہ ایک جذبے کے تحت اٹھے اور دنیا کو اپنے زیرِ نگیں کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر کیا۔ اسی طرح امریکا جس نے سعودی عرب میں اپنا اثر و رسوخ جمایا ہے۔ اگر وہ سعودی عرب کی اشرافیہ کو اپنے جذبۂ اقتدار سے مغلوب کر لیتا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ آہستہ آہستہ امریکا پورے یورپ، افریقہ اور ایشیا پر قبضہ کر لے گا۔ کیوں کہ سعودی عرب دنیا کا مرکز ہے اور مرکز کو اپنا قلعہ بنا کر دنیا کی چاروں سمت کے ممالک کو معاشی و سیاسی لحاظ سے فتح کرنا امریکا کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

ناول میں ایک اور جگہ مصنفہ نے معاشرے کو سمندر سے تشبیہ دیتے ہوئے عالم گیری تصورات کی توجیہ کی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح سب دریا سمندر میں آ کر ملتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں، اس طرح آج کے دور کا معاشرہ ایک ایسا سمندر بن چکا ہے۔ جس میں تمام دنیا کے معاشروں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، گویا اکیسویں صدی کا معاشرہ ایک ایسا سمندر بن چکا ہے جس میں دنیا کے تمام معاشرے ضم ہو چکے ہیں:

> بیٹے معاشرہ ایک سمندر کی طرح ہے۔ ادھر کی رو میں ادھر کی روئیں، اس میں آ آ کر ملتی رہتی ہیں۔ اگر پیچھے جاؤ تو تمھارے بڑے بھی کہیں سے تاشقند آئے تھے۔ پھر ہندوستان آتا، تاریخ ایسی باتوں سے ہی تو عبارت ہے اور پھر دیکھو معاشرے کے رسوم و رواج، سب کچھ اس ہجرت، تجارت، سفر پر ہی منحصر ہیں۔ [۴]

آمنہ مفتی کے ناول آخری زمانہ کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کی سیاست پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ تاریخ سے مکمل واقفیت بہم پہنچاتی ہیں۔ تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا شعور مصنفہ نے جابجا اپنے ناول میں بکھیرا ہے اور اکیسویں صدی کے قاری کو دعوت دی ہے کہ وہ ماضی کے آئینے میں اگر حال کے تناظر کو دیکھے تو اس کے لیے ان کے دور کا انتشار سمجھنا کوئی ناممکن بات نہیں۔ اقوامِ متحدہ اور دوسرے عالمی ادارے جس عالم گیریت کی تحریک کو فروغ دے رہے ہیں، آمنہ مفتی نے اس کے اہداف کا بھی مکمل احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے عصری منظر نامے پر موجود دنیا کے بڑے ممالک کی عالم گیریت کی تحریک میں وابستگی کو بھی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مختلف ممالک کا عالم گیر اداروں کا ممبر ہونا اور نہ ہونا اقوامِ عالم پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اس کی ایک جھلک ناول نگار نے یوں بیان کی ہے:

> اگر روس لینڈ لاکڈ نہ ہوتا، اگر ترکی NATO کا ممبر نہ ہوتا، تو دنیا کی سیاست میں بہت

فرق ہوتا۔ عربوں اور ترکوں کا دور گزر گیا کیوں؟ کیوں کہ ان کے دماغ جہاں تک ترقی کر چکے تھے اس کا پھل انھوں نے کھالیا تھا۔ They have regained that blessed seat اب انگریز کی باری تھی۔ سفید فام اور ایک خوب صورت نسل کی بازی۔ روس میں جو کچھ ہوا وہ اس کے جغرافیے کا بڑا منطقی انجام تھا اور اب کچھ جو ہمارے ہاں ہونے جا رہا ہے، وہ ہمارے جغرافیے کا منطقی انجام ہے۔[۵]

ماضی میں ایک ملک جب اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتا تھا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ دوسرے کم زور ملکوں پر اپنا تسلط جمانے کے لیے ان پر جنگ مسلط کرے اور قبضہ کر لے۔ پھر قابض ملک مفتوح ملکوں کو ایسی سیاسی، معاشی اور سماجی گورکھ دھندوں میں الجھاتے ہیں کہ کم زور ممالک کا مستقبل ایک غیر یقینی فضا اور عدم تحفظ کی حالت میں پروان چڑھتا ہے اور پھر وہ دنیا کے منظر نامے پر تیزی سے ترقی کرتے ہوئے دوسرے ممالک کے ساتھ قدم سے قدم نہیں ملا پاتے اور یوں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے زیرِ احسان اپنے مستقبل کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ ناول میں یہی دکھایا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ ایک بڑی عالم گیر تحریک کا بنیادی ہدف ہے اور اس ہدف کے حصول کے لیے کم زور ممالک پر جنگیں مسلط کر کے ان کو مفتوح بنانا ماضی کی روایت کا حصہ رہا ہے۔

ناول میں گلوبلائزیشن کے اس ہدف کو بیان کیا گیا ہے جس میں امریکا بہادر کا مقصد ہے کہ وہ پوری دنیا پر اپنی برتری جتائے۔ امریکی اشرافیہ اپنے اہداف کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں کہ دنیا کے چھوٹے ممالک میں متوسط طبقے کی زندگیاں کس الجھن اور کس عذاب کا شکار ہیں۔ اسے غرض ہے تو صرف اپنی برتری اور اپنے اقتدار سے، اسی لیے وہ طرح طرح کی حکمت عملیوں سے اپنے مقاصد کے حصول کی جتن کرتا رہتا ہے:

ارے امریکا بہادر کو کیوں بھولتے ہو؟ سب اس کی پلاننگ ہے۔ مجاہدین بھی تو اس کے لڑکے ہیں اور وہ خفیہ والے بھی، پروگرام یہ تھا کہ وہاں ایک کنٹرولڈ ورلڈ وار ہو گی۔ محض جنگ، اقوامِ متحدہ بیچ میں کود ے گا۔ کشمیر کے تین حصے کیے جائیں گے۔ ایک انڈیا کا، ایک ہمارا اور تیسرا حصہ جو وسطی ایشیا کو راستہ دے گا، آزاد رکھا جائے گا۔ پھر افغانستان میں جو مرضی ہو، اس بائی پاس سے سیدھے تاجکستان اور

پھر آگئے۔[۶]

یونس جاوید کا ناول ستو سنگھ کا کالا دن گلوبلائزیشن کے حوالے سے اہم ہے۔ اس ناول میں انھوں نے خاص طور پر اکیسویں صدی کے معاصر منظر نامے میں عالم گیر سطح پر مسلمانوں سے ہونے والے جانب دارانہ سلوک کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کو منعکس کیا ہے۔ ناول میں جہاں نائن الیون اور اس کے تناظر میں ہونے والی سیاسی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے، وہاں اس ناول میں عالم گیریت کی تحریک کے مقاصد کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ عالم گیریت جو بیسویں اور اکیسویں صدی کی سب سے جان دار تحریک ہے، نئی ٹیکنالوجی کی آمد سے یہ تیز رفتاری سے سب ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اس ناول میں عالمی سیاسی و سماجی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کسی طرح اپنی مصنوعات پیدا کر کے دوسرے ملکوں میں میڈیا کے ذریعے ایک تشہیری مہم چلاتے ہیں، جس سے دوسرے ملکوں میں خریدار پیدا ہوتے ہیں اور یوں اس تحریک کے معاشی مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار راشد ہے۔ جس کا تعلق پاکستان کے ایک زیریں متوسط طبقے سے ہے۔ وہ روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے کہ اچانک اس کی قسمت کھلتی ہے اور اسے امریکا کا ویزا مل جاتا ہے۔ وہ امریکا جاتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکا تو ایک الگ ہی دنیا ہے جس نے تمام انسانوں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ وہ امریکا کی معیشت اور سیاست سے بہت متاثر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے جانب دارانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ متعصبانہ سلوک ہر ہر مقام پر ہوتا ہے۔ امریکی سکیورٹی اور امریکی عوام بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ناول میں دکھایا گیا ہے عالم گیریت کی تحریک جس کے سب سے بڑے علم بردار یورپ اور امریکا ہیں، وہ کسی طرح اپنی پالیسیوں کے تحت پوری دنیا کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خواب رکھتے ہیں اور اسے روز بہ روز شرمندۂ تعبیر بھی کر رہے ہیں۔

> اس ملک کے احسان کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ اس نے لاکھوں ایسے آدمیوں کو اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا ہے جن کی وجہ سے آپ کے ملک میں بے شمار لوگ دنیا کی آسائشوں سے معمور ہو رہے ہیں۔[۷]

ناول نگار نے بیان کیا ہے کہ روزگار کی تلاش میں لوگ جب دوسرے ملکوں بالخصوص امریکا کا رُخ کرتے ہیں تو انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ امریکا ایک ایسی سرزمین ہے جس نے تمام لوگوں کو یہ دعوت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی اپنی شناخت کے مطابق یہاں زندگی بسر کریں لیکن ساتھ ہی اس کا منافقانہ رویہ تب سامنے آتا ہے جب وہ ان لوگوں کی انفرادی شناخت مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ امریکا میں بسنے والے مسلمانوں پر یہ منظر کھلتا ہے کہ وہ امریکا کی ایسی سازشوں کا شکار ہیں جو بظاہر تو بڑی خوش آئند لگتی ہیں لیکن حقیقت میں اندر ہی اندر مسلمانوں کے وجود اور ان کی شناخت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں:

> وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ ہم نے سیکڑوں برس دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی ہے، ہمارا عہد مثالی اور تاریخی رہا ہے۔ ہم ان باتوں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ آج جو لوگ ہمیں جھکانا چاہتے ہیں، ہمیں غلام بنانا چاہتے ہیں، وہ دراصل ہماری تاریخ سے واقف نہیں ہیں اور اسے جھٹلانا چاہتے ہیں۔[۸]

ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکا کی پالیسیاں دنیا کے تمام ممالک پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ امریکا اپنے مفاد کے حصول کے لیے کم زور ممالک کو معاشی طور پر اپنے زیرِ نگیں کرکے ایسی پالیسیاں بناتا ہے کہ دوسرے ممالک کی قومیں امریکا کے خلاف ناپسندیدگی کا رویہ رکھتی ہیں۔ امریکا کا اثر ورسوخ قومی حکومتوں پر اس قدر ہوتا ہے کہ کوئی حکومت صرف اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اپنی پالیسیوں کی تشکیل نہیں کر سکتی۔ اس کے پسِ پشت ہمیشہ عالمی طاقتوں کا ہاتھ رہتا ہے، اور یہ بڑی عالمی طاقتیں ہی عالم گیریت کی تحریک کی پشت پناہی کرتی ہیں:

> ہم یہاں کی حکومت کے تعلق سے امریکا اور اس کی عوام کو سمجھنا چاہتے ہیں جو زیادہ تر صحیح نہیں ہوتا۔۔۔ ہماری حکومت جس قدر عالمی پالیسی کو پکڑتی ہے قومی پالیسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتی۔ دنیا میں امریکا کے بارے جو بھی غلط فہمی ہے وہ صرف اس کی عالمی پالیسی کے سبب۔[۹]

ناول سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس عالم گیریت کے تناظر میں تشکیل دی جانے والی پالیسیوں کے مقاصد و اہداف کو بیان کرتا ہے۔ یہ پالیسیاں عالم گیریت کے جدید تصورات کی توسیع کا کردار ادا کرتی ہیں

جس میں اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات کو وسعت دینا ایک بنیادی ہدف ہے۔ عالم گیریت کے جدید تصور میں ذرائع نقل و حمل اور بین الاقوامی مصنوعات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ تجارت اور سرمایہ دارانہ نظام عالم گیریت کو مہمیز بخشتا ہے۔ عالم گیریت نے سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے سرمایہ دار طبقے میں اضافہ کیا اور آزاد منڈیوں کا راستہ بنا کر ایک عالمی منڈی کی بنیاد رکھی جس کی مصنوعات دنیا کے ہر کونے میں پہنچائی گئیں۔ اس ناول میں بھی عالم گیریت کے سیاسی و سماجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی معاشی پالیسیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے جس کا اظہار ناول کا مندرجہ ذیل اقتباس کرتا ہے جس میں ایک امریکی فرد جو سائنس کا پروفیسر رہا ہے، وہ ان حقائق کا ادراک کرکے آخر کار اپنی وائکن میں پناہ ڈھونڈتا ہے:

> وہ سائنس کا ایک ریٹائر پروفیسر تھا۔۔۔اسے کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا تھا۔ اب اس کا جی ان چیزوں سے اوب گیا تھا کیوں کہ اسے شدت سے محسوس ہوا تھا کہ نئی ایجادات، ریسرچ، تعلیمات اور فتوحات کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور خدمت تھا مگر انھیں انسان ہی کے خلاف استعمال کرنے کی سازش ہوتی رہتی ہے۔"[۱۰]

یونس جاوید کا یہ ناول جہاں نائن الیون کے واقعات اور اس کے بعد ہونے والی تبدیلیٔ حیات کی مختلف جہتوں کو بیان کرتا ہے، وہاں یہ ناول عالم گیر سطح کے سیاسی و سماجی پہلوؤں کا بھی مکمل بیان ہے۔ محمد شیراز دستی کا ناول ساسا بھی عالم گیریت کے چند پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے سلیم کو ناول کا مرکزی کردار بنایا گیا ہے اور اس کی تلاشِ محبت کی داستان کے ساتھ ساتھ چند دیگر پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جس میں عالم گیریت کی متنوع جہات بھی شامل ہیں۔ ناول کی کہانی گاؤں سے شروع ہوتی ہے جس میں سلیم دوسرے مرکزی کردار منزہ سے محبت کرتا ہے اور پھر اپنے تعلیمی سفر کی تکمیل کے لیے امریکا کا رخ اختیار کرتا ہے جہاں اس کی زندگی میں کلوراڈو یونی ورسٹی امریکا کی طالبات اینی اور جینا بھی شامل ہو جاتی ہیں لیکن بالآخر سلیم کی منزل اس کے گاؤں کی منزہ ہی بنتی ہے۔ ایک رومانوی کہانی کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے معاصر عصری مسائل اور سیاسی اور سماجی کش مکش کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں عالم گیریت کے کئی پہلو ملتے ہیں جس میں عالم گیریت کا معاشی پہلو سب سے نمایاں ہے۔ ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ طاقت وَر اقوام دوسرے ملکوں پر جنگیں مسلط کرتے ہیں اور بعد

میں مرنے والوں اور زخمیوں اور بے گھروں کے لیے فنڈز بھی خود ہی دیتے ہیں۔ ان کی یہ مدد بھی اس منافقت کو آشکار کرتی ہے کہ ان کی جنگوں کا مقصد بھی دوسرے ملکوں کو اپنے زیرِ تسلط کرنا ہوتا ہے تاکہ طاقت وَر ملکوں کی برتری ہمیشہ قائم رہے اور دوسرے ملک ہاتھ پھیلا کر ان سے بھیک مانگتے رہیں:

> کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ امریکا کی حکمت عملی ساز اداروں میں انسان نہیں شیطان بھرتی ہوتے ہیں۔ حاضرین میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے اور آپ کے پیسوں سے بھیجے گئے ان ڈرونوں میں مارے جانے والے نوے فی صد لوگوں کو امریکا کا نام تک معلوم نہیں۔ نہ ہی انھیں یہ معلوم ہے کہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ اگر آپ میں سے بھی کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو تو میں آپ کو بتاتا چلوں کہ جنگوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے مال بنانا۔ چاہے وہ گن اور گولی بیچ کر بنایا جائے یا مالِ غنیمت لوٹ کر سرمایہ داریت کا حصہ بنایا جائے۔"

ناول کے مندرجہ بالا اقتباس میں بڑے دوٹوک انداز سے ناول نگار نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اصل میں جنگوں کا مقصد بھی پیسہ بنانا ہوتا ہے۔ یہ جنگیں سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دینے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ کم زور ممالک تو پہلے ہی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے، اوپر سے ان پر جنگیں مسلط کرکے ان کا معاشی استعمال کیا جاتا ہے اور انھیں زندگی کی بنیادی ضروریات اور اپنے دفاع کے لیے عسکری ضروریات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور بعد میں اپنی ہی مصنوعات بیچ کر ان کو معاشی سطح پر کم زور جب کہ خود کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے فرد کی شناخت اور اعلیٰ طرزِ زیست سے محرومی کی بنیادی وجہ بھی استعماری طاقتوں اور سرمایہ دارانہ نظام کو بتایا ہے، جس کی تصدیق مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

> ہم جب ایک بچہ پیدا کرتے ہیں تو دراصل ہم استعمار کو ایک اور غلام عطا کر دیتے ہیں، سرمایہ داروں کو ایک اور خریدار دے دیتے ہیں۔ اس عالم میں راج کرتی بیماریوں کو، یہاں کے وائرسوں کو ان کے آسان شکار دیتے ہیں۔"[۱۲]

اسی طرح اس ناول میں ناول نگار نے استعماریت اور سرمایہ دارانہ نظام پر چوٹ کی ہے کہ وہ کس طرح معاشرے کو اپنی مصنوعات کی خریداری کے لیے مجبور کر دیتے ہیں اور یوں عالمگیر کا معاشی ہدف آسانی

سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اُردو ناول کے اپنے پلاٹ، قصہ پن، کہانی، کردار، اسلوب اور فن پر گلوبلائیزیشن کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔آج کے ناول میں تمام فلسفیانہ نظریات کو بھی پیش کیا جارہا ہے۔ ناول کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس کے کرداروں اور کہانی میں اتنا تنوع ہے کہ ساری دنیا ان کے اندر سمٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ناول کے ایک کردار کا تعلق اگر پاکستان سے ہے تو دوسرا کردار امریکا یا کسی یورپی ملک کا ہو سکتا ہے۔ ان کرداروں کی آپس کی گفتگو ایک عالمی مکالماتی منظر نامہ فروغ دیتا ہے۔

عالم گیریت نے اکیسویں صدی کے انسان کو ایک ایسے تہذیبی اور فکری موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں شناخت، اقدار، ثقافت اور انسانی رشتے مسلسل تغیر اور انتشار کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ یہی اضطراب جدید پاکستانی اُردو ناول کی فضا میں پوری شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ پاکستانی اُردو ناول اب محض داخلی معاشرت کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ عالمی سیاسی، معاشی اور تہذیبی قوتوں کے زیرِ اثر بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

جدید سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو صارف میں تبدیل کر دیا ہے۔ خواہشات کی مصنوعی افزائش، میڈیا کی ذہن سازیاں، اشتہارات کی چکاچوند اور منڈی کی تہذیب نے انسانی احساس کو ایک نئی کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ پاکستانی اُردو ناول اس کش مکش کو نہایت باریک بینی اور فکری گہرائی کے ساتھ آشکار کرتا ہے۔ ناول کے کردار اکثر ایسے معاشرتی جبر کا شکار دکھائی دیتے ہیں جہاں تہذیبی وابستگیاں کمزور پڑتی ہیں اور مادّی ترجیحات انسانی قدروں پر غالب آتی محسوس ہوتی ہیں۔

اکیسویں صدی کا پاکستانی اُردو ناول تہذیبی تصادم اور شناخت کے بحران کا بھی ایک اہم حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ مشرقی روایت اور مغربی فکر کے درمیان پھیلی ہوئی ذہنی اور ثقافتی کش مکش جدید ناول کے کرداروں میں داخلی بے چینی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہجرت، جلاوطنی، تنہائی، عدم تحفظ اور روحانی خلا ایسے موضوعات اسی بدلتی ہوئی دنیا کی علامتیں ہیں، جہاں انسان ترقی کے باوجود باطنی سکون سے محروم دکھائی دیتا ہے۔

میڈیا اور ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو بظاہر قریب کیا مگر باطن میں فاصلے اور اجنبیت کو بھی بڑھایا۔ جدید پاکستانی اُردو ناول اسی دوہری کیفیت کو فنی شعور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ رشتوں کی شکست و

ریخت، خاندانی نظام کی کمزوری، طبقاتی تفاوت اور ثقافتی انتشار ایسے عناصر ہیں جو ناول کی فکری ساخت میں مسلسل نمایاں ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جدید انسان ایک ایسی دنیا میں زندہ ہے جہاں ترقی کی رفتار تیز ہے مگر روحانی اور اخلاقی قدریں زوال پذیر ہیں۔

پاکستانی اُردو ناول نگاروں نے عالم گیریت کے اثرات کو محض قبول نہیں کیا بلکہ ان کے تہذیبی اور انسانی مضمرات پر گہری نظر بھی رکھی ہے۔ ان کے یہاں مزاحمت کا ایک خاموش مگر طاقت وَر احساس موجود ہے جو مقامی ثقافت، انسانی وقار اور تہذیبی شناخت کے تحفظ کی صورت سامنے آتا ہے۔ یہی احساس جدید اُردو ناول کو محض بیانیہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے اپنے عہد کا فکری اور تہذیبی مکالمہ بنا دیتا ہے۔

عصرِ حاضر کا اُردو ناول انسانی زندگی کے انھی متضاد تجربات، تہذیبی الجھنوں اور فکری انتشار کی جمالیاتی تعبیر ہے۔ اس میں ایک ایسی دنیا کی بازگشت سنائی دیتی ہے جہاں عالمی طاقتیں، سرمایہ، میڈیا اور ٹیکنالوجی انسانی شعور کی تشکیلِ نو میں مصروف ہیں، مگر ادب اب بھی انسان کے باطن، اس کی شناخت اور اس کی تہذیبی یادداشت کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرتا دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، ''فلیپ''، مشمولہ: غلام باغ، مرزا اطہر بیگ (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۵۳۔
۲۔ فتح محمد ملک، اپنی آگ کی تلاش (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ۶۳۔
۳۔ آمنہ مفتی، آخری زمانہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء)، ۳۵۲۔
۴۔ ایضاً، ۳۶۰۔
۵۔ ایضاً، ۳۶۲۔
۶۔ ایضاً، ۳۸۱۔
۷۔ یونس جاوید، ستونت سنگھ کا کالا دن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۱۳۶۔
۸۔ ایضاً، ۱۴۱۔
۹۔ ایضاً، ۱۴۸۔
۱۰۔ ایضاً، ۱۶۱۔
۱۱۔ ایضاً، ۱۶۳۔
۱۲۔ محمد شیراز دستی، ساسا (لاہور: عکس پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۹ء)، ۱۱۱۔